کرشمۂ تقدیر

جناب بلقیس خاتون صاحبہ جمال

مرزا یونس کچھ ایسے بڑے دولت مند تو نہ تھے پھر بھی خدا کا دیا سب کچھ گھر میں موجود تھا۔ حویلی میں خاصی راؤں بھاؤں، ڈیوڑھی پہ کافی چہل پہل تھی۔ مردانے میں نوکر چاکر، زنانے میں مامائیں سیلیں موجود تھیں۔ ہر طرح کا عیش ہر قسم کی آسائش مہیا تھی۔ سونے پر سہاگہ خدا نے قدسیہ جیسی نیک اور سلیقہ شعار بی بی عنایت فرمائی تھی۔ جس نے اپنے حسن انتظام سے اندر باہر سب سنبھال رکھا تھا دو معصوم لڑکیاں تلے اوپر کی اور دو ننھے منّے لال، ماں باپ کی زندگی کی کمائی، سال سال بھر قدسیہ کی گود میں کھیل کھیل کر جنگل بسا چکے تھے۔ یہ صدمہ کچھ کم نہ تھا مگر قدسیہ جیسی نیک عورت چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہ ملے۔ کلیجہ پر صبر کی سل رکھ کر خدا سے لو لگائے خاموش بیٹھی رہی۔

زمانہ بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ تقدیر پلٹتے منٹ نہیں جاتے۔ یگانوں بیگانوں نے مرزا یونس کے کان بھرنے شروع کئے کہ ایسی منحوس عورت کہ کوئی بچہ آنگن نہ کھیلنے پایا۔ مرزا یونس پکے مولوی، کٹر نمازی۔ مینہ آئے آندھی جائے مگر کیا مجال کہ کسی وقت کی نماز قضا ہو جائے۔ بڑے لڑکے کے انتقال پر، ہر چند لوگوں نے سمجھایا کہ یہ گھر وایا ہی منحوس ہے۔ کوئی اور مکان لیجئے۔ لیکن وہ اس سے مس نہیں ہوئے۔ پرانے وقتوں کے آدمی کون کہے، اونچ نیچ سے واقف نہ تھے مگر اس گھڑی کچھ ایسے عقل پر پردے پڑے کہ دوسری شادی کا ارادہ کر لیا اور رضیہ بیاہ کر چھاتی پر آ بیٹھی۔ قدسیہ سمجھدار عورت زمانہ دیکھے بھالے سوکنوں کی ہیرا کیری سے اچھی طرح واقف کچھ ایسی ہلکی نہ تھی کہ ہمت ہار کر بیٹھ رہتی شوہر کی آنکھیں

دیکھیں سوکن کے تیور پہچاننے کی کوشش کی۔ اور اُسے اوّل دن سے بیزار پاکر سوچ میں پڑ گئی کہ دیکھئے یہ بیل کس طرح منڈھے چڑھتی ہے۔ کچھ دن تو رضیہ خاموش رہی مگر پھر تو زہر اگلنا شروع کیا اور مرزا یونس کو قدسیہ سے بیزار کر کے چھوڑا۔ شادی سے دو سال بعد مرزا کو جنگ پر چڑھا کر یہ منحوس گھر چھوڑنے پر تیار کر لیا۔ اور اپنے میکے لکھنؤ جانے پر آمادہ کر لیا۔ مرزا یونس کچھ ایسے زن مرید ہو چکے تھے۔ کہ خاموشی سے آبائی وطن ترک کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ بدنصیب قدسیہ کو سان گمان بھی نہ تھا کہ رضیہ یوں گل کھیلے گی اور مرزا اس کی پٹی میں آ بھی جائیں گے۔ مگر جب بالکل تیار پایا تو روئی دھوئی۔ میاں کی خوشامدیں کیں سوکن کے ہاتھ جوڑے پر انہوں نے کسی طرح نہ مانا۔ آخر عورت تھی مرد کے سامنے کیا چلتی تقدیر پر شاکر ہو کر خاموش بیٹھ رہی۔ مرزا یونس اپنی آبرو کو نوکروں اور عزیزوں کے سہارے چھوڑ کر چل دیئے اور قدسیہ غریب تنہا اور سنسان مکان میں خدا کے نام پر اکیلی بیٹھی رہ گئی۔

(۲)

اس کی مہربانیوں کے صدقے اس کے رحم و کرم کے قربان جس نے بدنصیب قدسیہ کو مرزا کے جانے کے سات ماہ بعد سلیم جیسا چاند دیا۔ مردہ امیدوں میں جان آ گئی۔ دل کی کلی چٹک گئی۔ شوہر پرست عورت مرزا کی یاد میں جی کھول کر روئی۔ مگر بل بے مرزا۔ کہ ساتوں کے سات مہینے گذر سے بھول کر بھی نہ پوچھا کہ قدسیہ کمبخت تو بھی کبھی کوئی تھی۔

قدسیہ نے اب سلیم کی آس پر دوبارہ زندگی پائی۔ صورت دیکھتی اور نہال

ہو جاتی۔ خیال کرتی اور روح میں تازگی آجاتی۔ اول تو بچہ اور پھر وہ بچہ جسے بدنصیب ماں نے جوگ کما کر پایا تھا۔ قدسیہ غریب کے لیے یہ سہانی آنکھوں ہی آنکھوں میں سال بھر گذر گیا اور سلیم کو دوسرا برس لگا۔ قدسیہ کو اس سے بڑھکر کیا خوشی ہو سکتی تھی۔

(۳)

غدر کی طوفان انگیز ہوا نے دہلی کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا۔ مصیبت کی گھٹائیں آئیں۔ آفتوں کی آندھیاں چلیں۔ خون کی بارش ہوئی اور دہلی کا کوئی فرد چین سے نہ رہا۔ مرد کے نام اللہ کا نام تھا۔ عورتوں کی عزت آبرو کے رکھوالے خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ مرزا یونس کی حویلی کے تہ خانے میں چاندنی پر تین چار عورتیں سہمی سہمائی سکڑی سکڑائی بچوں کو کلیجہ سے لگائے بیٹھی ہوئی زمین آسمان تک رہی تھیں۔ ایک ایک آنکھ سے ہزار ہزار آنسو جاری تھے لوگوں کی دھڑا دھڑی بندوقوں کی زائیں زائیں جانیں نکالے لیتی تھیں۔ انہیں جہنم جلی عورتوں میں قدسیہ بھی چار برس کی جان چھاتی سے لگائے بیٹھی کانپ رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اگر آج ان دو تین محلہ والیوں کا ساتھ نہ ہوتا تو قدسیہ تو شاید مارے ہولوں کے ہو بھی چکتی۔ بھرا پرا گھر اور ایک اسی کی جان۔ پتا کھڑکتا اور بدنصیبوں کی سن سے نکل جاتی۔ آہٹ ہوئی اور ایک دوسرے سے چمٹ کر رہ گئیں۔ نہ کھانے کی خبر نہ پینے کی سدھ۔ تین دن صاف گذر گئے اور کسی کے منہ میں کھیل تک اُڑ کر نہ گئی۔ ہر لحظہ یہی ہول کہ دیکھیں اب کیا خبر آتی ہے۔ ہر لمحہ یہی ڈر کہ یا اللہ اب کیا ہوتا ہے۔ سلیم نے بھوک سے بے چین ہو کر رونا شروع

کیا۔ قدسیہ نے لاکھ لاکھ سنبھالا مگر سلیم مچلا تو ایسا کہ کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ اتنے میں خاندانی ملازم عبداللہ نے پکار کر کہا بیگم صاحبہ جلد باہر آجیے۔ دشمن سر پر آپہنچے۔ مکان کے پہلے حصہ میں آگ لگادی گئی ہے اس کی زبان سے اتنا نکلنا تھا کہ عورتوں کے کلیجے دہل گئے ہزار ہمت باندھتیں خدا پر نظر کرتیں مگر حول دور نہ ہوتی۔ گھبرا کر اٹھیں۔ چادریں سروں پر ڈالیں بچوں کو گود میں لیا اور تہہ خانے کا دوسرا دروازہ کھول کر باہر آئیں اور عبداللہ کی ہمراہی میں ایک طرف کو چل کھڑی ہوئیں۔ خدا کی شان جن پردہ نشین عورتوں نے کبھی ڈیوڑھی سے قدم نہ نکالا تھا انہیں یوں بے اختیار دوڑنا پڑ رہا ہے۔ کہ اگر جوتی جاتی رہے تو مڑ کر اس لئے نہیں دیکھتی کہ کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ ذرا سی چلیں اور پاؤں دو دو من کے ہو گئے اٹھائے نہ اٹھتے تھے اور ہلائے نہ ہلتے تھے۔ عبداللہ غریب باری باری سے بچوں کو سنبھالتا۔ سچ تو یہ ہے جیسا نمک کا حق اس ضعیف نوکر نے ادا کیا۔ خدا ہی جانتا ہے۔ قدسیہ سہموں کی ماری تکان سے بے قابو ہو رہی تھی۔ سلیم کاندھے سے لگا ہوا سو گیا تھا۔ عبداللہ نے کہا بیگم صاحبہ سلیم کو مجھے دیجئے۔ دوڑتے دوڑتے آپ بالکل تھک گئی ہیں۔ ہونی شدنی کہ قدسیہ نے سلیم کو عبداللہ کے حوالے کیا اور خود بمشکل چلنے لگی۔

(۴)

ٹاپوں کی آواز آنی شروع ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو دشمن سر پر۔ دیوانہ وار بھاگنا شروع کیا۔ قدسیہ دوڑتے دوڑتے بالکل نڈھال ہو گئی تھی۔ ایک ٹھوکر کھائی اور دھڑ سے گر پڑی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی اور وہ بیہوش ہو گئی۔ ہوش آیا ادھر ادھر

دیکھا چاروں طرف ویران درخت دیوؤں کی طرح سر پر لدے چلے آتے تھے چیخ ماری" ہائے سلیم" اور بیہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ روتی پیٹتی پچھاڑیں کھاتی۔ خاک اڑاتی، تڑپتی مچلتی اور ایک ایک درخت سے کہتی للٰلہ میرے دل پر رحم کرو اور بتاؤ عبداللہ میرے لال کو لے کر کدھر گیا۔ جتنا سوچتی اتنا ہی کلیجہ بیٹھتا۔ یہ زندگی کا طوفان کس کے سہارے بیٹھی رہوں۔ شوہر نے ایسا منہ موڑا کہ گرمیاں آئیں۔ برساتیں گزریں۔ جاڑے ہوئے۔ بہاریں پھولیں مگر پلٹ کر نہ دیکھا۔ لے دیکے سلیم کی جان تو وہ بھی اس نامراد غدر کے کارن پھوٹ گئی، جوں جوں سوچتی کلیجہ پر سانپ لوٹتا۔ دل تڑپتا۔ خون کے آنسو بہتے۔ سینہ میں آگ لگتی۔ لبوں سے آہ نکلتی۔ سلیم کی بھولی بھالی صورت آنکھوں میں پھرتی۔ توتلی باتیں کانوں میں گونجتیں اور مایوس ہو کر بیہوش ہو جاتی۔ جوشِ تصور دو گھڑی کے لئے سلیم کی تصویر لا کر کھڑی کر دیتا، دوڑ کر چپٹا لیتی، پیار کرتی بلائیں لیتی۔ منہ دھلاتی کپڑے بدلتی، کاجل لگاتی اور سینے پر لٹا لیتی، نہ سر کا ہوش نہ پاؤں کی خبر۔ بیخودی میں چادر بھی سر سے گر گئی۔ قدسیہ کے حالِ زار پر دریائے رحمت جوش میں آیا۔ غیب کے تسلی بخش ہاتھوں نے مضطرب دل کو سنبھالا۔ ڈھارس بندھوائی قدسیہ اٹھی اور خدا کی درگاہ میں گر پڑی۔ گڑگڑا گڑگڑا کر سلیم سے ملنے کی دعائیں مانگیں۔ تھوڑا سا سکون نصیب ہوا اور اسی دھن میں ایک طرف کو چل کھڑی ہوئی۔

شام کی پیاری شام مردہ دلوں کو زندگی بخش رہی تھی۔ ہرے بھرے بوٹے ہر طرف لہرا رہے تھے۔ کنوئیں کی جگت پر چار پانچ عورتیں تانبے اور مٹی کے گھڑے

لئے ہوئے پانی بھر رہی تھیں۔ قدسیہ نے ان سے ایک چلو پانی مانگا۔ حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ پانی کے دو تین قطرے ٹپکائے اور بھوکے پیاسے سلیم کے خیال سے تڑپ گئی۔ زبان سے نکلا بھوکے پیاسے سلیم۔ ہائے دکھیا ماں کو چھوڑ کر کہاں چلا گیا اور بیتاب ہو کر رونے لگی۔ ان رحمدل عورتوں نے حال پوچھنا شروع کیا۔ قدسیہ نے بلک بلک کر اپنی داستان سنائی۔ ان عورتوں کے دل بھر آئے۔ ساتھ لے جانے پر اصرار کیا۔ قدسیہ تھکی ہاری تو تھی ہی۔ ایک جھونپڑے میں ان کے ساتھ جاکر بیٹھ گئی۔ گھر کی مہمان نواز عورت نے خدا اس کا دین دنیا میں بھلا کرے۔ جہانتک ہو سکا خاطر تواضع کی۔ دال دلیا جو کچھ موجود تھا سامنے لاکر رکھدیا مگر قدسیہ نے ایک ٹکڑا بھی توڑا ہو تو حرام۔ منہ لپیٹ کر پڑ رہی۔ آنکھ لگی تو خواب میں وہی صورت پیشِ نظر۔ چیخ کر دوڑی۔ پٹ سے آنکھ کھل گئی۔ دل مسوس کر رہگئی۔ کلیجے کو کوئی اندر ہی اندر کھرچنے لگا۔ آنسو ساون بھادوں کی جھڑیاں بن گئے۔ نیند اُڑ گئی بقیہ رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

(۵)

خدا کو اپنے بدنصیب بندوں پر رحم آیا۔ اللہ اللہ کرتے جانوں کی خیر مناتے کہیں غدر کی قیامت میں کمی ہونی شروع ہوئی۔ دہلی آباد ہونے لگی۔ دکانیں کھلیں۔ ویران گھر آباد ہونے لگے۔ چلبلے دل اس کشت و خون کی داستان لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ قدسیہ بھی کچھ لوگوں کے ہمراہ اپنے شکستہ مکان میں واپس آئی۔ گھر کی جانب دیکھا سلیم آنکھوں میں پھر گیا۔ در و دیوار کاٹنے کو دوڑنے لگے۔ کمرے دالان بھائیں بھائیں کرنے لگے۔ روئی اور جی

کھول کر روئی، چیخیں ماریں، پچھاڑیں کھائیں۔ تمام گھر میں دیوانوں کی طرح پھری سلیم کے ٹوٹے پھوٹے کھلونے مل گئے۔ ایک ایک کو آنکھوں سے لگایا۔ کلیجہ پر رکھا اور بیہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو منہ لپیٹ کر پڑ رہی۔ لوگوں نے ہزار دل بہلانے کی کوشش کی مگر اس کے دل کی آگ ایسی نہ تھی جو بجھائے بجھ جائے عزیزوں نے بدنصیب قدسیہ کے حال زار پر خدا کا خوف کھا کے سلیم کی تلاش شروع کی اگرچہ امید نہ تھی مگر بہت عرصہ سرگاڑی اور پیر پہیہ کرتے رہے آخر بہت دن بعد معلوم ہوا کہ عبداللہ دہلی سے کچھ دور مارا گیا

اتنا سننا تھا کہ قدسیہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ امید کا ایک تنکا باقی تھا سو وہ بھی ناکامی کی تیز ہوا کے جھونکے سے اڑ گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا آیا۔ دل کو ٹھوکر لگی۔ لاکھ صبر کی کوشش کرتی مگر دل پر آرے سے چلتے کلیجے میں ٹیسیں اٹھتیں اور آنکھوں سے آبلے پڑتے۔ عزیزوں نے دکھیاری قدسیہ کے لئے بہتیرے پاپڑ بیلے۔ مگر سلیم کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ نہ معلوم زمین کھا گئی یا آسمان۔ دن گذرے۔ راتیں بیتیں۔ موسم بدلے۔ سال گذرے۔ دنیا غدر کو بھولنے لگی مگر قدسیہ کے دل پر ایسا زخم نہ لگا تھا جو اتنی جلدی بھر جاتا۔ لوگ سلیم کو بھول گئے۔ مگر اس کا مامتا بھرا دل کسی حالت میں بھی نہ بھول سکا۔ اٹھتی تو اس کا دھیان، بیٹھتی تو اس کا خیال، سوتی تو وہی پیش نظر، جاگتی تو وہی سامنے، پھول کھلتے اور اس کے کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا۔ تارے نکلتے اور اس کی آنکھیں ساون بھادوں کا سماں دکھلانے لگتیں۔ صبح ہنستی تو وہ رونے لگتی۔ شام روتی تو اپنی تقدیر پر کھسیانی ہنسی ہنستی۔ درخت پتوں سے لد جاتے تو وہ اپنی خالی گود

دیکھ کر بے تاب ہو جاتی۔ ڈالیاں پھولوں سے بھرتی تو وہ اپنا پہلو سنسان دیکھ کر تڑپ اٹھتی۔ مامتا والی مائیں اس کا عالم دیکھ کر تڑپ جاتیں مگر کسی کا کچھ بس نہ چلتا۔ برسیں گذریں لیکن اس کا دل بہلانے میں کوئی کامیاب نہ ہو سکا سات برس پورے سات برس گذر گئے مگر کسی طرف سے سلیم کی بو نہ آئی لیکن قدسیہ کے دل میں امید کا دھندلا چراغ اسی طرح جھلملاتا رہا۔

(۶)

کہتے ہیں بارہ برس بعد کوڑی کے دن بھی پھرتے ہیں۔ یہی مثل آج قدسیہ پر صادق آئی کیسی خوشی کا دن۔ کیسی مسرت کی گھڑی جس قدسیہ کے خشک لب آٹھ برس سے مسکراہٹ سے ناآشنا تھے۔ وہی آج زعفران زار ہو رہی تھی بارہ پورے بارہ برس بعد آج مرزا کی آمد کی خبر تھی۔ لوگ ادھر ادھر سے آ کر مبارک دیتے عزیز احباب قدسیہ کی خوشی میں شرکت کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ کھانے پک رہے تھے۔ مکان سج رہا تھا۔ سلیم کی یاد اس وقت بھی قدسیہ کے دل سے نہ گئی۔ مگر اس کے نام کے ساتھ کوئی خوشی اندر ہی اندر اس کے دل کو مسرور کر دیتی ساڑھے بارہ بجے لڑکے خبر لائے کہ مرزا آ پہنچے۔ گاڑیاں دروازے کو لگیں۔ قدسیہ ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی ڈیوڑھی میں جا پہنچی۔ گاڑی سے رضیہ اتری اور قدسیہ سے گلے لگ گئی۔ دونوں سوکنیں پہلی مرتبہ صاف دل سے ملیں۔ رضیہ کے مزاج میں یہ فرق دیکھ کر قدسیہ کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔ اتنے میں مرزا داخل ہوئے قدسیہ نے خاوند کی جانب دیکھا اور سر جھکا لیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے مرزا کے پیچھے پیچھے ایک گورا چٹا نو عمر لڑکا۔ کالا کوٹ پہنے پٹ پٹ آنکھیں مارتا آ

تھا۔ قدسیہ کی نگاہ لڑکے پر پڑی۔ نظریں چار ہوئیں۔ قدسیہ نے ایک چیخ ماری۔ ہائے سلیم اور دھڑ سے بیہوش ہو کر گر پڑی۔ مرزا حیران۔ رضیہ متحیر اور عزیز پریشان ہو گئے۔ مرزا نے لوگوں سے حال پوچھنا شروع کیا۔ قدسیہ کے بھائی مرزا محمود نے ساری داستان کہہ سنائی۔ مرزا یونس ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہ گئے لوگوں نے قدسیہ کے ہوش کی تدابیریں کیں۔ قدسیہ نے آنکھ کھولی سلیم کی جانب دیکھا اور پھر چکر آ گیا۔

(۷)

قدسیہ نے قسمیں دے دے کر حال پوچھنا شروع کیا۔ آخر رضیہ نے یہ قصہ شروع کیا۔ کہنے لگی کہ :۔ جب ہم لکھنؤ پہنچے تو تین ماہ بعد میرے یہاں لڑکا ہوا مگر وہ دو ماہ بعد جنگل جا سویا۔ اسی لال کی موت پر میرا دل ایسا مرا کہ کسی خوشی سے خوش نہ ہوتی۔ شاید یہ رنج رفع دفع ہو جاتا مگر وہ دن ہے اور آج کا دن کہ پھر کسی بچہ کی صورت نظر نہ آئی میکے جا کر میرا مزاج حد کو پہنچ گیا۔ آخر کب تک سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا۔ مرزا ناراض ہوتے چلے گئے۔ اور کچھ دن بعد میری صورت ایسی زہر لگنے لگی کہ باہر رہنا شروع کیا۔ اسی برس مجھ بدنصیب کی ماں جنت کو سدھاریں اور بھائی حیدر آباد چلے گئے۔ اب قلعہ سا گھر اور میرا اکیلا دم۔ رات کو ایسا ڈر لگتا کہ ذرا نیند نہ آتی۔ خدا کو کچھ میرے حال پر ترس آیا۔ اور میری خالہ حج کر کے آئیں میں ان سے مل کر خوب روئی۔ مرزا کا حال سنایا اور تعویذ گنڈوں کی منتیں کیں۔ خالہ بیچاری کا خدا بھلا کرے۔ روئیں روئیں سے ان کے لئے دعا نکلتی ہے۔ انہوں نے مجھ بے دین کو ایسی ایسی نصیحتیں کیں کہ پتھر بھی ہوتا تو پانی ہو جاتا۔ ان کے

قدموں کی برکت سے میرا دل دنیا سے اُچٹ گیا اور رات دن توبہ کرنے لگی۔ مرزا سے بھی معافی مانگی اور جان توڑ خدمت سے رام ہی کر لیا۔ اور وہ بات جو مجھے لاکھوں کے تعویذ گنڈوں سے حاصل نہ ہوتی تھی۔ بے دام مل گئی۔ کچھ دن کے بعد غدر کی آفت پڑی۔ دہلی سے کچھ انگریز بھاگ کر لکھنؤ گئے ہم نے ایک میم کو چھپا لیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ اس نگوڑی نے خون کیا تھا۔ اس کی گود میں ایک لڑکا تھا انگریزن تھی زخمی اور بچے کے پھول سے بدن پر بھی کئی زخم لگے ہوئے تھے۔ بہن میرا دل اس بچے کو دیکھ کر بہت کڑھا اور مرزا تو خوب روئے۔ بچہ حیران تھا اور بالکل گپ چپ۔ انگریزن زخموں کی ماری رات کو انتقال کر گئی۔ بچہ ہمارے ہاتھ آیا۔ اور قسم ہے وحدہٗ لاشریک کی اپنے بچے سے زیادہ محبت سے رکھا۔ میری خالہ میرے ساتھ ہی رہتی تھی۔ ان کی صحبت نے مجھ جیسی وحشت زدہ کو انسان بنا دیا اور یہاں تک کہ اب میں نے تمہارے ساتھ رہنے کی خواہش کی اور ہم تینوں یہاں آئے تقدیر کا تماشہ۔ دیکھئے جو سوتیلی ماں خون کی پیاسی ہوتی ہے بس نہیں چلتا کہ سوتیلیوں کا گلا گھونٹ دے۔ سلیم نے اس کے ہاتھوں اور حقیقی باپ کی گود میں پرورش پائی اور اللہ نے تمام بچھڑوں کو اس طرح ملایا۔ اتنا کہہ کر رضیہ نے سلیم کا ہاتھ قدسیہ کی طرف بڑھایا اور کہا۔ لو بہن تمہاری امانت تمہارے سپرد ہے۔ یہ کہہ کر رضیہ رونے لگی اور قدسیہ کے بھی آنسو امڈ آئے۔

تمام شُد